آخری خواب سے پہلے

فاروق نازکی

آخری خواب سے پہلے

فاروق نازکی

شاعر : فاروق نازکی

خوشنویس : محمد یوسف مسکین

طبع نقشِ اول : جون ۱۹۹۰ء

قیمت : ۵۰ روپے

مطبع : جے کے آفسٹ پرنٹرز، جامع مسجد، دہلی

سرورق : غلام رسول ملتوش

نصرت اور امین کے نام

وہ کرم کیا جو محبت میں مٹا دے مجھ کو
آخری خواب سے پہلے نہ سزا دے مجھ کو

"آخری خواب سے پہلے"
کی طباعت
زیرِ اہتمام
"آوازِ دوست" پبلشرز، ۴۷ بیرونی کاٹھی دروازہ سرینگر
کشمیر

پیش گفتار

• فاروق نازکی کی مختصر بیاض پر نظر ڈالتے ہوئے مجھ پر عجیب کیفیت گذری۔ مجھے ایسا لگا کہ کوئی جنگلی دوشیزہ کسی ڈھیلے ڈھالے پیرہن کو ترک کر کے شباب کی تمام لطافتوں کو یکایک دریافت کر رہی ہے۔ شاید اس کیفیت کا اندازہ اُسی کے ایک شعر سے ہو گا ؎

میں نے اس جسم کے اَن دیکھے جزیرے دیکھے
بحرِ اسوَد پہ رواں دِل کا سفینہ دیکھا

فاروق اپنی زندگی میں شرمیلا نہیں ہے لیکن اس نے اپنی شاعری کی بات ہمیشہ LOW PROFILE میں کی ہے۔ ورنہ اس شاعری کے اختصار کے باوجود یہ کشمیر میں ایک نئی آواز اور لہجے کے شاعر کی آمد کا اعلان ہے۔ یہ نہیں ہے کہ مجھے فاروق کی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں تھا۔ آج سے کوئی دس برس پہلے کی بات ہے کہ اُسے کلچرل اکادمی کی طرف سے مقبول

کراله واری کی "گلریز" کے منظوم ترجمے کا کام سونپ دیا گیا۔ مقبول نے اپنی اس مثنوی کا موضوع مشہور فارسی عالم اور شاعر ضیاءالدین نخشبی سے مستعار لیا ہے۔ لیکن اس کو اپنے فن کے لمس سے ایک ایسی تخلیق بنا دیا ہے جو کشمیری زبان کا لافانی شاہکار بن گئی ہے۔ اس کے کارنامے کی فنی کامرانی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ میری ناچیز رائے میں آیندہ نخشبی کے اس کارنامے کا ذکر صرف اس کے کشمیری ترجمے کے توسط سے ہوگا۔ فاروق نے اس کے ابتدائی بیس تیس اوراق کا ایسا نفیس اور شاندار ترجمہ کیا کہ مجھے لگا کہ وہ مقبول پر بھی بازی لے گیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اس نے زبان کا تازہ کارانہ اور تخلیقی استعمال کیا تھا بلکہ اس نے مثنوی کے استعارے کو بھی اس خوبصورتی سے اردو لباس میں ڈھالا تھا کہ ہر شعر برجستہ، برمحل اور صاعقہ بدوش نظر آتا تھا۔ ہمارے اصرار کے باوجود اس نے مثنوی کا ترجمہ مکمل نہیں کیا اور ہم کیوں کر اور کب کے ہیر پھیر میں کفِ افسوس ملتے رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری کے ساتھ بہت کم آمیزی کا سلوک کرتا ہے۔[۱]

فاروق کے شعر کی دوسری شناختی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک شدید طور پر ذاتی (INTENSELY PERSONAL) اظہار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کائنات کو پہچاننے اور اس کے تجربوں کا لین دین کرنے کے لئے اپنی ذات کو

---

[۱] مثنوی گلریز کا اردو میں منظوم ترجمہ مکمل ہو چکا ہے اور عنقریب ہی زیورِ طبع سے آراستہ ہوگا۔

ایک مستند DENOMINATOR کی حیثیت سے استعمال کرنے سے نہ شرماتا ہے اور نہ گھبراتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کے تجربات میں انسانی شفقت کا ایسا تیکھا انداز پیدا ہو گیا ہے جس سے کائنات اور معاملات پر ایک مخصوص نقطۂ نظر کی سُنہری دُھند چھا جاتی ہے اور اس کے نقوش زیادہ معنی خیز اور حیرت انگیز بن کر اُبھرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اس کی نظم "تیزاب آکار خوشبو کا" سارے جدید ادب میں ایک انوکھے تجربے کی حیثیت رکھتی ہے۔

فاروق کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ اس پر فیض احمد فیض کا اثر ہے۔ جہاں تک لہجے کی نرمی اور گھلاوٹ کا تعلق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی سرگوشیاں بعض اوقات لفظیات کے استعمال میں فیض کے ہمسایہ لگتی ہیں لیکن مُشابہت صرف اسی خارجی کیفیت تک محدود ہے۔ فیض مقصد اور کمٹ مینٹ کا شاعر ہے اور اسی لئے اقبال کے بعد وہ ہمارے سیاسی لیڈروں اور نعرہ بازوں کو سب سے زیادہ راس آتا ہے۔ فاروق نازکی شعر کی بنیادی ماہیت کا متوالا ہے اور اسی لئے اس کے یہاں اگر کوئی مقصد جھلکتا ہے تو وہ شعرِ مطلق کا قالب دریافت کرنے کی سعی ہے۔ یہاں میں اپنا یہ تاثر بیان کر دوں کہ مجھے ایسا لگا کہ جیسے اختر شیرانی جدید کنکریٹ کے جنگلوں میں وارد ہو کر اپنی رومانی روح کو جدید اصطلاحوں میں بیان کر رہا ہے اور روایت اور جدّت کا یہ آمیزہ تیزاب اور خوشبو کا آکار بن گیا ہے۔ سہ

ملن کی رُت ہے ہتھیلی پہ چاند ٹھہرا ہے
گڈریئے شام سے پہلے ہی گاؤں آ پہنچے!

پردۂ ذہن پہ اُبھرے ہیں ہزاروں سورج
رات دیکھا تھا کسی پردہ نشین کا چہرہ

اختر شیرانی کے مزاج کی بعض خصوصیات رکھنے کے باوجود فاروق نازکی کی شاعری جدید حسیّت کی شاعری ہے۔ وہ تنہائی اور زہراب کا جارگن تو استعمال نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود اس کی SENSIBILITY بہت ہی تازہ کارانہ اور معاصرانہ ہے اور میرے خیال میں وہ جارگن کی شاعری کرنے والوں سے زیادہ پُرکشش اور پائیدار ثابت ہوگا۔

یاد رکھ میں تیرے ہاتھوں میں ہوں خنجر کی طرح
ہو نہ ہو تیرے ہی سینے میں اُتر جاؤں گا
منّتِ سنگِ ملامت نہ اُٹھاؤں گا کبھی
دل کی دیوار سے سر پھوڑ کے مر جاؤں گا
کتابیں پڑھ کے شک اپنے بڑھے ہیں
یقین کے واسطے چہرے پڑھے ہیں

فاروق نازکی زبان کے برتاو اور لہجے کے گداز کے لحاظ سے اُردو شاعری کو معاصر کشمیر کا تحفہ ہے اور یہ وہ کارنامہ ہے جو ہماری پہلی اور دوسری پیڑھی کے

اُردو شاعر انجام نہ دے سکے لیکن اس کے باوجود اس کی مقامیت روشن ہے اس نے کشمیری کلچر کی اصطلاحوں اور علامتوں کو اُردو میں اس برجستگی سے سمویا ہے جیسے برگِ گُل شبنم سے نہاتا ہے۔ ذیل کے مصرعے میں "نبِ آسمان" کا استعمال دیکھیئے ع

نُب کی بندش ڈھیلی ہوگی

یا "یار خدایا پاپ نوار " کا تکرار آواز اور بازگشت۔

مجھے یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ اس نے کشمیر کے ایک گمنام مگر خوش گو شاعر خواجہ حسین برتگنی کے اس بے بدل مصرعہ

آئینہ فروش شہر کوراں ہستم

کی جدید لہجے میں یوں گونج پیدا کی ہے

اسی بستی میں اندھے بس گئے ہیں

اسی بستی میں وافر آئینے ہیں

مجھے یقین ہے کہ اس مختصر بیاض کے سہارے فاروق نازکی کی آواز اُردو شاعری میں اپنے لئے استناد اور اعتبار کا مقام حاصل کرلے گی۔ کاش وہ اپنی ذاتی زندگی کے شور شرابے کا انتقام اپنی شاعری کو LOW PROFILE میں رکھنے سے نہ لیتا اس کی شاعرانہ لَو کے اونچا ہونے کیلئے اُردو اور کشمیر دونوں آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں۔

محمد یوسف ٹینگ

سرینگر ۶ جون ۱۹۸۴ء

غزلیات

سر بہ سر عشق ہوں عنوانِ وفا دے مجھ کو
میرا خیال ہے ایسا ہی ہو گیا ہوگا
میں سرِ دار بھی کچھ دیر ٹھہر جاؤں گا
بڑے خلوص سے اِک اِک کو ٹھگ رہا ہوگا
اندھیرے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں
خلا نہ صحرا نہ باغ لکھ دے
میری آنکھوں سے رواں، آگ کا دریا رکھنا
جام و سبو جلے کہیں شمس و قمر جلے
وقت کو جن پہ کبھی ناز رہا، ہم ہی تھے
کہتے ہیں کہ فاروق وفادار بہت ہے

مَنظُومات

اور پھر یوں ہُوا

تنہائی

دُعا

اعتراف

یاد دہانی

سبز پرندہ

زیورِ نَو

سَر پہ آسمان بھی نہیں

سوغات

اِقراء

یادِ فراموش

ایک مکالمہ

برف اندر برف

گلُریز

آسماں چُپ رہا

ایک نظم

وَالّیلَ اِذا یَغشٰی

تب کیا ہوگا

نوحہ

پیلا سُورج

لوری

غزلیات

سر بہ سر عشق ہوں عنوانِ وفا دے مجھ کو
لوگ کہتے رہیں صدیوں وہ کہانی دے دے

تو اگر ہے مرے اندر تو صدا دے مجھ کو
اپنا پیغام مجھے اپنی زبانی دے دے

مُضطرب ہوں میں سمندر میں مِلا دے مجھ کو
بند دریا ہوں مجھے اِذن رَوانی دے دے

کتنے یُگ بیت گئے کوئی بتا دے مجھ کو
میرے کھوئے ہوئے پیکر کی نشانی دے دے

تُو نے لکھا ہے مجھے تو ہی مٹا دے مجھ کو
اوّلیں نقش ہوں میں صورتِ ثانی دے دے

اپنے خوابوں کے دریچوں میں سجا دے مجھ کو
موسمِ ہجر کو کوئی تو معانی دے دے

ہو سکے تجھ سے تو ایسی نہ سزا دے مجھ کو
جنسِ ارزاں نہ بنوں مجھ کو گرانی دے دے

وادئ گُل کی ہواؤں سے مِلا دے مجھ کو
رُوح تپتی ہے کوئی شام سُہانی دے دے

مُجھے نہ پا کے یہاں مُجھ کو رو گیا ہو گا
مِرا خیال ہے ایسا ہی ہو گیا ہو گا

کہاں تلاش کروں شہرِ ہاؤ و ہُو میں اُسے
وہ ماہ و سال کے جنگل میں کھو گیا ہو گا

اُگاؤں کیسے اُسے آبگینۂ دِل میں
اگر وہ خود کو خلاؤں میں بو گیا ہوگا

گئی بہار کے سپنے چُھپا کے آنکھوں میں
لبادہ برف کا اوڑھے وہ سو گیا ہوگا

لکھوں تو کیسے لکھوں لفظ کا نوحہ
وہ حرف میں خنجر چبھو گیا ہوگا

میں سرِ دار بھی کچھ دیر ٹھہر جاؤں گا
تو نہیں آیا تو میں جاں سے گزر جاؤں گا

پیکرِ وقت میں ڈھل جاؤں گا لمحوں کی طرح
کون کہتا ہے کہ ذہنوں میں اُتر جاؤں گا

مِنّتِ سنگِ ملامت نہ اُٹھاؤں گا کبھی
کِسی دیوار سے سر پھوڑ کے مَر جاؤں گا

یاد رکھ میں تیرے ہاتھوں میں ہوں خنجر کی طرح
ہو نہ ہو تیرے ہی سینے میں اُتر جاؤں گا

اب تو بس ایک ہی اُلجھن میں گرفتار ہوں میں
جو تیرے شہر سے نِکلوں تو کِدھر جاؤں گا

کِتابیں پڑھ کے شک اپنے بڑھے ہیں
یقین کے واسطے چہرے پڑھے ہیں

بڑے خلوص سے اک اک کو ٹھگ رہا ہوگا
وہ جو نہیں ہے وہی سب کو لگ رہا ہوگا

اُسے کسی سے بچھڑنے میں کیا تردّد ہو
تمام عمر جو خود سے الگ رہا ہوگا

اُسی کے آگے میں دستِ سوال پھیلاؤں
کبھی جو ساتھ میرے مثلِ سگ رہا ہوگا

میں جس کے واسطے دُنیا سے لاتعلق ہوں
وہ میری یاد میں خود بھی سُلگ رہا ہوگا

(ارشد مُفتی کے نام)

اندھیرے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں
ستارے آسماں سے جھڑ رہے ہیں

اسی بستی میں اندھے بس گئے ہیں
اسی بستی میں وافر آئینے ہیں

سحر انجام شب کی دسترس میں
ہماری چشمِ پُرنم کے دیئے ہیں

نظر کی قید سے آزاد ہو کر
خلاؤں کے مسافر چل پڑے ہیں

تَلاطُم نغمہ تھا بہتی ہوا کا
اِسی رَو میں زمانے بہہ گئے ہیں

سیہ بختی سے زُلفِ پُرشکن تک
ہماری آرزو کے سِلسلے ہیں

تردّد، خوف، بے زاری، تلوّن،
یہی لے دے کے اپنے مشغلے ہیں

خلا نہ صحرا نہ باغ لکھ دے
میرے لئے اِک ایاغ لکھ دے

سیاہ کاغذ پہ سُرخ لَب سے
جو ہو سکے تو چراغ لکھ دے

خلا سے اُترے ہوئے مسافر
ہلا کسی کا سُراغ لکھ دے

بدن کے دریا میں قید ہوں میں
بدن سے مجھ کو فراغ لکھ دے

گناہ کے مُوقلم سے میری
جبینِ سادہ پہ داغ لکھ دے

میری آنکھوں سے رواں آگ کا دریا رکھنا
اُس کے ماتھے پہ چمکتا ہوا ہیرا رکھنا

دامنِ شب پہ لرزتے ہوئے جگنو کی طرح
احمریں ہونٹ پہ ٹھہرا ہوا شعلہ رکھنا

میں بھی اُس جسم کے اَن دیکھے جزیرے دیکھوں
بحرِ اسوَد پہ رواں دِل کا سفینہ رکھنا

ایک چھوٹی سی تمنّا ہے کبھی پوری ہو
رات کی گود میں بے داغ سویرا رکھنا

جو ہم سے ہو چکے نہیں شمس و قمر جلے
جلنا نہ پائے تھے وہ سارے گھر جلے

دل کے مکان کو آگ لگی ہے کچھ اس طرح
پہلے مکین بعد میں دیوار و در جلے

ہم کو اُسی نظر سے ملی ہے جنوں کی داد
محفل میں جس کے اُٹھتے ہی اہلِ نظر چلے

چشمِ زدن میں تیرہ نصیبی تمام ہو
وہ شمع ایک بھی جو مرے پیشِ نظر جلے

اے شہرِ بے چراغ، تری ظلمتوں کی خیر
ہم بھی تو تیرے ساتھ یونہی تا سحر چلے

نیند تو خواب ہو گئی کب سے
خواب کیوں جاگتے میں آتا ہے

وقت کو جن پہ کبھی ناز رہا، ہم ہی تھے
وقت بے وجہ نہیں بھول گیا، ہم ہی تھے

وہ جو اُترے تھے سرِ شام کبھی آنگن میں
چاندنی رات میں دینے کو صدا ہم ہی تھے

بجلیاں، جن کے نشیمن سے بہت جلتی تھیں
جن پہ اِتراتی رہی موجِ ہوا ہم ہی تھے

اپنی دیوارِ بدن ہم سے کبھی سر نہ ہوئی
ساتھ رہ کر جو رہے خود سے جُدا، ہم ہی تھے

عین واجب ہے اگر اس کی سزا ہم کو ملی
یہ حقیقت ہے گُنہگارِ وفا ہم ہی تھے

کہتے ہیں کہ فاروقؔ وفادار بہت ہے
اس واسطے ہر شخص سے بیزار بہت ہے

یہ شہر بھی کیا خوب ہے اس شہر میں کوئی
سچ بول کے جی لے تو خطاوار بہت ہے

بے خوابی و بیداریٔ شب تُم کو مُبارک
ہم کو تو ہمارا دِل بیدار بہت ہے

اے مَوجِ صَبا در پہ مرے ہلکی سی دستک
یہ رات شَرر بار شَرر یار بہت ہے

دامانِ نظر تنگ ہے کیا جلوے سمیٹوں
مُفلِس کے لئے رونقِ بازار بہت ہے

موسمِ گُل سے بَرف زاروں تک
سینکڑوں رنگ میں بَدلتا ہوں

تہمتِ سیرِ چمن ہم پہ لگی کیا نہ ہُوا
طبعِ آزاد میں زنجیر پڑی کیا نہ ہُوا

وہ الم دوست تھے ہم جن کی ہر اک موسم میں
دیکھتے دیکھتے خوشبوں سے ٹھنی کیا نہ ہُوا

خواب تو خواب رہے، نیند بھی آنے سے رہی
گردِ بیداریٔ شب مُنہ پہ مَلی کیا نہ ہوا

سینۂ برگِ گُلِ تر پہ نظر تھی اپنی
زندگی آگ کے سانچے میں ڈھلی کیا نہ ہوا

ہم تو کیا چیز تھے اس شہر کے ہنگاموں میں
اہلِ دانش کی کہاں پیش چلی کیا نہ ہوا

ملن کی رُت ہے ہتھیلی پہ چاند ٹھہرا ہے
گڈریئے شام سے پہلے ہی گاؤں آپہنچے

باسی شبدوں کے پیکر
گاڑو مٹی کے اندر

جھوٹی باتوں کی اُترن
بکتی ہے چوراہے پر

چہرہ مہرہ خال و خط
تصویروں کے خالی گھر

طوفانوں کی آمد ہے
پنچھی لوٹ رہے ہیں گھر

لکھ دے سب کچھ میرے نام
دریا، طوفان اور بھنور

اپنا معاملہ بھی جہاں میں عجب رہا
عہدِ شباب بھی پسِ دیوارِ شب رہا

اِک اپنی ذات تھی جو فراموش ہو گئی
باقی جو زندگی نے دیا یاد سب رہا

تُم پر عنایتوں کی سمن پاشیاں ہوئیں
ہم پر تمام عمر غضب ہی غضب رہا

اپنے نگر میں گُم شُدگاں میں شمار تھے
پھر بھی خیال گھر کا ہمیں بے سبب رہا

دریائے خونِ خلق میں تیرے گا آدمی
اس کا خیال اس کا گُماں کس کو کب رہا

برگِ چنار اب کے حِنا سے تہی رہے
رنگِ خزاں بھی اب کے برس کُچھ عجب رہا

اے شہرِ نامُراد ترے بانکپن کی خیر
ہم پر تری بہار کا سایہ ہی کب رہا

پردۂ ذہن پہ اُبھرے ہیں ہزاروں سورج
رات دیکھا تھا کسی پردہ نشین کا چہرہ

کمالِ عجز ہی جس کا کمال ٹھہرا ہے
مری نگاہ میں وہ لازوال ٹھہرا ہے

یہ لوگ ذہن میں کانٹے بچھائے بیٹھے ہیں
اگرچہ پھول ہی وجہ سوال ٹھہرا ہے

وہ لاجواب تھا ہم کو جواب کیا دیتا
ہمارے ہونٹوں پر آکر سوال ٹھہرا ہے

اُسی نے سب کے رگ و پے میں زہر گھول دیا
وہ ایک شخص جو شیریں مقال ٹھہرا ہے

ہُنر یہی تو ہے فاروق نازکی تیرا
کہ بے ہُنر ہے مگر باکمال ٹھہرا ہے

(بلقیس ظفیر الحسن کے نام)

رنگوں کی گہرائی کا
جھگڑا سب بینائی کا

مجھ کو مجھ سے دور کیا
نام نہ لو ہرجائی کا

یہ موسم کب لگتا ہے
شوخی کا رعنائی کا

بے خوابی ہی بے خوابی
ہرجانہ تنہائی کا

یہ تو ایک کہاوت ہے
بھائی دشمن بھائی کا

باہر سے جو بھی آیا پریشان کر گیا
ہم کو ہمارے گھر میں ہراسان کر گیا

ناگر نگر وہ تیری مطلا عمارتیں!
معمار میرے عہد کا ویران کر گیا!

جاتی رہیں چنار کے پتّوں کی سُرخیاں
جاڑے کا زور شہر کو ویران کر گیا

یہ طے ہے اُس کے سر پہ ہزاروں کا خون تھا
ماتھے پہ میرے داغ جو چسپاں کر گیا

آنکھیں تلاش کرتی رہیں خواب میں جسے
آج اس تپاک سے مِلا حیران کر گیا

یوں قاتل کا نام نہ لے
اپنے سر الزام نہ لے

قسمیں، رسمیں، پاس، لحاظ،
ان حربوں سے کام نہ لے

نیکی کر دریا میں ڈال
بدلے میں انعام نہ لے

پچھلی رُت کا حال سُنا
اس موسم کا نام نہ لے

سات سمندر کا ہے سفر
سُست روی سے کام نہ لے

یونہی کر لیتے ہیں اوقات بسر اپنا کیا
اپنے ہی شہر میں ہیں شہر بدر اپنا کیا

رات لمبی ہے چلو غیبتِ یاراں کر لیں
شب کسی طور تو ہو جائے بسر اپنا کیا

دوریاں، فاصلے، دُشوار گُذر گاہیں ہیں
ہے یہی شرطِ سفر، رَختِ سَفر اپنا کیا

تُجھ سے اب اذنِ تکلّم کبھی اگر مل جائے
لَب ہلیں یا نہ ہلیں، آنکھ ہو تر اپنا کیا

جام پھر تازہ کرو، رات بہت لمبی ہے
کُچھ تو کرنا ہے میاں تا بہ سحر اپنا کیا

چاندنی آسماں سے اُترے گی
میرے آنگن سے ہو کے گذرے گی

رات ، جنگل ، مُہیب سناٹا
اب یہاں تیرگی ہی اُترے گی

بہتے پانی پہ کس نے لکھا ہے
ناؤ کاغذ کی پار اُترے گی

بوئے گُل بن کے جیب تو آجائے
دشت میں بھی بہار اُترے گی

بات تیشہ نہیں مگر پھر بھی!
بات پتھر کے دِل میں اُترے گی

مُدام ساغر کے پاس رہنا
مگر سَبُو ناشناس رہنا

ہماری عادت سی بن گئی ہے
کِسی سَبب سے اُداس رہنا

ہمیں تو اب اضطرار میں بھی
بُرا لگے بَدحواس رہنا

یقیں کی شمعیں جَلا بُجھا کر
شریکِ بزمِ قیاس رہنا

یہ شب بہت معتبر نہیں ہے
جو ہو سکے آس پاس رہنا

جوان موسم کی شاہزادی!
شجر شجر بے لباس رہنا

پورے قد سے میں کھڑا ہوں سامنے آئے گا کیا
میں تیرا سایہ نہیں ہوں مجھ کو سمجھائے گا کیا

آندھیوں پر اُڑ رہا ہے جن پرندوں کا ہجوم
آسماں کی وُسعتوں سے لوٹ کر آئے گا کیا

اِک نئے منظر کا خاکہ آسماں پر کیوں نہیں
چاند اپنی چاندنی پر یونہی اِترائے گا کیا

فصلِ گُل کے بعد پت جھڑ یوں تو اک معمول ہے
خوف بن کر پھر در و دیوار پر چھائے گا کیا

جانبِ شہرِ غزالاں پھر چلی شامِ فراق
دشت کی بے خوابیوں کا رازداں آئے گا کیا

درد کے کالے سمندر کی تلاطُم خیزیاں!
روک دے گا کوئی منظر نُور برسائے گا کیا

خون کی روتی سفیدی ، بے صدا سازوں کا شور
بے سر و پا گیت کوئی بے زبان گائے گا کیا

ہے غزل آزاد گویا ، بے در و دیوار گھر!
ہم کو بھی اس صِنفِ بے جا کا ہُنر آئے گا کیا

دلِ خراب کو پامال کر کے رکھ دیں گی
دراز دستیاں کوتاہ آستینوں کی

زمین تنگ ہوئی ہے جنوں کے ماروں پر
میں جانتا ہوں نوازش ہے نازنینوں کی

رُخِ جمیل پہ گردِ ملال رہنے دو!
کِسے پڑی ہے خوشامد کرے حسینوں کی

وہ مُضطرب تھا مگر پُرسکون لگتا تھا
اُسے خبر تھی کئی گُم شُدہ سفینوں کی

خیال ٹوٹ کے گرتے ہیں آسمانوں سے
غزل میں بات نہ کر مجھ سے اب زمینوں کی

گُلاب کِھلتے ہیں جب جسم کے جزیروں پر
بہت تڑپ ہے مرے دِل میں اُن مہینوں کی

اِک آن سمندر کے تلاطم میں گھِرا ہے
اِک آن سمندر کے کنارے پہ کھڑا ہے

مضمون ہے یا صورتِ عنوان نُما ہے
وہ پردۂ معنی میں بدستور چُھپا ہے

معلوم نہیں مجھ کو کہ وہ کون ہے کیا ہے
اُس شخص کا انداز مگر سب سے جُدا ہے

ہرچند رہا ساتھ مرے سائے کی مانند
وہ شخص اشارہ نہ ادا ہے نہ صدا ہے

کل رات اکیلے میں مرے کان میں بولا
وہ غیر نہیں آج کے انسان کا خُدا ہے

○

ہم نے تو کوئی بات نرالی نہیں دیکھی
کہتے ہیں کہ فاروق کا انداز جُدا ہے

مَنظُومات

اور پھر یوں ہُوا

ایک پھیلی ہوئی شاخ کاٹی گئی
پیڑ زخمی ہُوا
پردۂ خاک سے پردۂ ساز تک
سرسراتی ہواؤں نے نوحے پڑھے
شاخ تا شاخ رونے کی آئی صدا

اور پھر یوں ہوا
شاخ کچھ روز میں اک عصا بن گئی
جس سے ریوڑ کو ہانکا گیا
پیڑ زخمی ہُوا
پات گرنے لگے
پیڑ خالی ہُوا
سایہ سایہ ہر اک سمت آئی صدا

اور پھر یوں ہُوا

میرا اک ہاتھ کٹ کر زمین پہ گرا
میرا بچھڑا ہوا ہاتھ جلتی ہوئی ریت پر
پھڑپھڑانے لگا
انگلیاں ہاتھ کی گنگنانے لگیں
حد سے بڑھتے ہوئے ہاتھ توڑے گئے
حد سے بڑھتی ہوئی شاخ کاٹی گئی

تنہائی

شور کی بستی سے نکلے
اور اک پُر شور دریا کے کنارے پر کھڑے
سوچتے ہیں
وقت اب کیسے کٹے

سامنے کالا سمندر یاد کا
دور تک بھُورا پہاڑی سلسلہ
سبز سونا
سایۂ اشجار میں گھُل مِل گیا

دھوپ کالی چوٹیوں پر سو گئی
نیلی پیلی تتلیاں خود رو گلوں کو چومتی
بہتے پانی پر اڑیں، کچھ بہہ گئیں، کچھ کہہ گئیں
شام کا سونا نگر آباد کر

جامِ زرّیں دستِ سیمیں میں اٹھا
ہاتھ کی گہری لکیروں کو بدل
پھول سے رخسار پر آنچل نہ ڈال
ہونٹ پیاسے ہیں انہیں امرت پلا
رات کو گلنار کر
نزدیک آ۔

دُعا

اس طرح ہو کہ ہر اک پھول پہ بھنورا ناچے
اس طرح ہو کہ نہ ہو بیمِ خزاں گلشن میں
اس طرح ہو کہ بہاروں کی مہکتی رُت میں
آسماں جاگ اُٹھے جیسے ہی پنچھی چہکیں
میگھ ملہار کوئی گائے تو بارش آئے
مہرباں رات ہو، ہر چاند ہو مستی بردوش
ماتھے ضَو پاش ہوں، بچّوں کی کتابوں کی طرح
اس طرح ہو کہ نگاہوں میں مُروّت جاگے
سامنے کوئی بھی آجائے، کہیں سے آئے
دِل مِلے دِل سے تو ہر سمت محبت جاگے

بے خودی بانٹ لیں، خوابوں کے جزیروں کی طرح
آنکھیں آنکھوں سے ملیں، دل کے سفیروں کی طرح

ایک دوجے سے بگڑ جائیں مگر آخر کار
ایک دوجے سے گلے مل کے ملاقات کریں
بھیگے موسم کی، زمستان کی کوئی بات کریں
آلہا گائیں، کبھی کاد، کبھی کجری ہو
بھانگڑا ہو کہ تماشا ہو کہ جشنِ کشمیر
رشکِ صد نازِ بتاں، نازشِ فردوس بنے

ہاتھ اٹھ جائیں مگر ہاتھ ملانے کے لئے
روٹھ بھی جائیں کبھی تم کو منانے کے لئے

(سیّد مرزا کے نام)

اعتراف

مجھ کو سولی پہ چڑھا دو مجھے سنگسار کرد
میرے ہونٹوں کے دریچے کو مُقفّل کر دو
میری آنکھوں کی بصارت کے دیئے گُل کر دو
میرے کانوں میں پگھلتا ہوا سیسہ بھر دو

میں نے چڑھتے ہوئے سورج کی پرستش کی ہے
ڈوبتے چاند کو گرنے سے بچایا تُم نے!

یاد دِہانی

وہ دِن یاد نہیں کیا تُم کو
جب ہم دونوں رات گئے تک
تہ خانے کے اندھیاروں میں
سِلوٹ سلوٹ ٹاٹ پہ لیٹے
اِک دُوجے کو کاٹ رہے تھے

اندھیارے کی چادر اوڑھے
چھپ جانے کی بنتی کرتے
اور پھر ڈرتے
ڈرتے ڈرتے ہاتھ اٹھا کر
دونوں کہتے

"بار خدایا۔ پاپ نوار"[1]

[1] مصرعہ کشمیری۔ نند رشی

سبز پرندہ

جان لیوا ہے گھٹن سبز پرندہ چُپ ہے
اپنی ہی بات گلوگیر ہوئی جاتی ہے
ہونٹ ٹھہرے ہوئے سوکھے ہوئے پتّوں کی طرح
سانس ہلتی ہوئی زنجیر نظر آتی ہے
جرسِ دل کو ذرا کوئی ہلا کر دیکھے
کب تلک قافلۂ عمرِ رواں ٹھہرے گا
کوئی سایہ نہ کوئی پیڑ، بہت گرمی ہے
روکنے والو کہو، کوئی کہاں ٹھہرے گا

آج کی رات اِرادوں پہ گراں گُذری ہے
آج کی رات سِتاروں پہ گراں گُذری ہے

لو سَرِ دار کوئی شعلۂ نفس پہنچا ہے
پھر اَنا موت کا پیغام ہوئی جاتی ہے
دستِ سقراط میں اب زہر بھرا جام نہ دو
یہ اَدا باعثِ الزام ہوئی جاتی ہے!

زبورِ نو

گُماں کے شہر میں اوہام کے مکانوں سے
نکل پڑے تھے کئی کارواں یقینوں کے
جمالِ صُبح میں تھا قتلِ ماہتاب کا رنگ
فلک کی مانگ میں کچھ داغ تھے جبینوں کے

نظر نظر سے ٹپکتا تھا زہر کا الماس
دِلوں میں پلتے تھے جب سانپ آستینوں کے

ہمیں نے اپنا مُقدّر لکھا تھا پانی پر!
ہمیں نے آگ لگائی تھی خود سفینوں میں
یہ اُن دنوں کی کہانی ہے جن دنوں ہم تُم
چھُپاتے پھرتے تھے اک دوسرے کو سینوں میں

ازل سے ریت پہ لکھی گئی تھیں تقدیریں
فنا کے شہر میں آئے تو جاوداں ٹھہرے
وہ جب بھی اُترے ہیں اونچائیوں سے اُترے ہیں
جو قربِ ذات کی لذّت کے رازداں ٹھہرے
ہمارے سر میں نہ تھا کچھ بھی سرکشی کے سوا!
رواں دواں بھی رہے اور کہاں کہاں ٹھہرے

یہ اُن دنوں کی کہانی ہے جن دنوں ہم تم
اسیرِ تارِ نظر، تارِ عنکبوت نہ تھے
دُھلی دُھلی تھی فضا، آسماں تھا آئینہ
ہماری رُوح تھی قاصد وہ میگھ دوت نہ تھے

دیارِ نور سے ظلمات کے جزیروں تک !
جہاں سے گذرے تھے ہم سربلند گزرے تھے
اندھیری رات سے اُٹھے تھے آفتاب بدست
فضائے دہر میں کرنوں کی طرح بکھرے تھے
روائیتوں کے سیہ پانیوں میں ڈوبے تھے
نئے خیال نئے ولولوں میں اُبھرے تھے

یہ اُن دنوں کی کہانی ہے جن دنوں ہم تُم
قبائے شمس و قمر نوچنے پہ آتے تھے
ہمارے سر سے گزرتے تھے کارواں کیا کیا
ستارہ وار فضاؤں میں ہم سماتے تھے

جلالِ ارض، جمالِ نجوم و شمس و قمر
وجودِ خاک میں ہر ایک شے سمٹ آئی
جہاں جہاں بھی گئے وقت کے بیاباں میں
ہر ایک سمت انا البحر کی صدا آئی
ہزار بار مٹا فاصلہ مَن و تُو کا
خرد کے ساتھ اُٹھائی جنوں نے رُسوائی

یہ اُن دنوں کی کہانی ہے جن دنوں ہم تم
جنوں کی راہِ پُر اسرار کے مسافر تھے
پئے کلید درِ شہرِ آرزوئے وصال
ثریٰ سے تابہ ثُریا کہاں کہاں نہ گئے

دیارِ گُل سے اُٹھے غُسلِ آتشیں کر کے
بُجھی نہ آگ تو پیراہنِ شرر پہنا
جبیں پہ راکھ مَلے نامُراد لمحوں کی
شَبِ وِصال کفن خوں میں تر بہ تر پہنا
فرازِ دار سے ہم نے سفر کیا آغاز
لباس راس نہ تھا سایۂ شجر پہنا

صبا کے ہاتھ سے زخموں کی فصل کاٹی ہے
سیاہ رات کی مٹی میں پاپ بوئے ہیں
جو دُھل سکے نہ تری رحمتوں کی خوشبو سے
وہ داغ ہم نے لہو کی کرن سے دھوئے ہیں

ہم اپنی ذات کے معبد میں سر جھکاتے ہیں
تم ایک بحر ہو، صحرا ہو، ایک عالم ہو
سرشت آگ ہے پتھر سے پیار شیوہ ہے
تم ایک پھول ہو، موتی ہو اور شبنم ہو!
ہمارا نام تو الفاظ کو ترستا ہے
تمہارا نام نہیں تم تو اسمِ اعظم ہو!

کہیں تو کیسے کہیں حرفِ مدعا تم سے
کھلے ہیں لفظ مگر بند ہے درِ معنی
ہمارے پاس تو کہنے کو کچھ رہا ہی نہیں
کوئی خیال نہ پیکر نہ مظہرِ معنی

خودی کے زخم سجے بے خودی کے چہرے پر
وجود، ذات، انا، آگ کا سمندر ہے
ہر ایک یاد ہے سنگِ مزار کی مانند
دلِ خراب ازل ٹوٹ پھوٹ کا گھر ہے
نفس کی آنچ سے پیکر جھلسنے والے ہیں
خیال، فکر، تصوّر شرارہ گستر ہے

بمنزلے کہ رسانیدہ بے خودی مارا
نہ نام روئے زمین و نہ آسماں اینجاست
نگاہ کن نہ گنہگار جنبش لب شو
نہ تاب دیدن و نے طاقتِ بیاں اینجاست

گڑے ہیں پاؤں جہاں یہ تو لامکاں بھی نہیں
عجیب بات ہے اب سر پہ آسماں بھی نہیں

سر پہ آسماں بھی نہیں

لبانِ خُشک پہ ہے گردِ التجائے مُراد
زمانہ برسرِ پیکار، آسمان ناشاد
نظر میں چاند ہے آغوش میں ثُریا ہے
مگر وجود تہ خاکِ آرزو برباد

میرے شباب کے نادیدہ خواب کی حوریں
نگر سے دور کہیں پربتوں میں ہیں آزاد
گئے کہاں وہ تمنّا کے خوش نوا طائر
پُکارتا ہے جنہیں بام آرزوئے مُراد!
جو ہو سکے تو نہ دو تُم ہوا کو اذنِ خرام
کنارِ آب رہیں ریت کے نگر آباد!

سوغات

رات سنسان ہے خاموش سمندر کی طرح
وقت سویا ہوا لیٹے ہوئے ساحل کی طرح
لمحے ساکت ہیں کہ بکھرے ہوئے کنکر ہر سو
تھم گئی چور ہوئی آج پلوں کی پایل
جانے کس دشت میں ٹھہرے ہیں ہوا کے جھونکے
چاند نکلا ہے سیہ فام لبادہ اوڑھے
کرنیں لرزاں ہیں کہ پگھلا ہوا لوہا برسے
گرد میں گم ہیں پگھلتی ہوئی سونی راہیں

تلوے جلتے ہیں اِدھر پاؤں پھسل جاتے ہیں
سانس جلتی ہے کہ سینے میں چِتا جلتی ہے
کہکشاں دُھول میں لپٹی ہوئی اک راہ گزُر
بامِ مہتاب کہاں اوجِ ثریّا بھی نہیں
خاک آلودہ ہے اُوشا کی حنائی اُنگلی
مشعلِ غم بھی اندھیروں میں بُجھی جاتی ہے

اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اکیلا فاروق
خواب نادیدہ کی سوغات لئے پھرتا ہے
اور کیا لاتا یہ تمثیل کی دُنیا کا فقیر
حرفِ ناگفتہ کی سوغات لئے پھرتا ہے!

اِقراء

نیم مُردہ اُنجم و مہتاب ہیں
رات دہشت ناک ہے
گُلستاں پژمُردہ، جلوے خُون رنگ
کہکشاں تا کہکشاں خاموشیاں
اے مری تنہائیوں کے رازداں

لب کُشائی کر خُدا کے واسطے

یادِ فراموش

ایک طوفاں اُٹھا
ایک آندھی چلی
زندگی کی کلی تھرتھرا کر گری
'یوں گری، جیسے بھولی ہوئی یاد ہو
یوں اُڑی جیسے بولی ہوئی بات ہو

ایک طوفاں اُٹھا
ایک آندھی چلی

ایک مکالمہ

جب تجھے وقت ملے
یاد دلانا مجھ کو
وہ شبِ وصل کہ جب نور کے دریا پہ کھڑے
ہم نے دیکھی تھی
تلاطم میں جھکولے کھاتی
پیلے اخبار کے کاغذ کی بنائی ہوئی ناؤ

جب تجھے وقت ملے
یاد دلانا مجھ کو
وہ کڑکتی ہوئی دوپہر کہ جب
ایک سنسان سڑک ہم کو نگلتی گذری
لوگ چلتے رہے بے نام دِشاؤں کی طرف
اور سب اپنے گھروں تک پہنچے

ہم مگر بھول گئے اپنے ہی گھر کا رستہ

جب تجھے وقت ملے
یاد دلانا مجھ کو
تیز خورشید
گھنے بن کا مقدس سایہ
تا بہ نہ دونوں تھے افلاک کی راہوں پہ رواں
تیری قربت میں بھی احساس تھا تنہائی کا
وقت خاموش تھا ٹھہرا ہوا دریا جیسے
ہم بھی خاموش تھے ٹھہرا ہوا دریا جیسے

جب تُجھے وقت مِلے
یاد دِلانا مجھ کو
پہلے دریا کا کِنارا
وہی پروائی کی چاپ
تُم نے [illegible]یرے سے کہا
"درد میٹھا ہو تو خوشیاں بھی تصدّق اُس پر"
پہلے دریا نے سُنا
گونگے پیڑوں سے کہا
میگھ نے بات سُنی
اور موسم سے کہی
'بوئے گُل' بن کے تری بات صبا تک پہنچی
میں نے بھی شعلۂ اظہار لپکتا دیکھا
جب کبھی وقت مِلے
یاد دِلانا مُجھ کو
کیا وہی میں ہوں، وہی تُم ہو، وہی دریا ہے"

برف اندر برف

پھر وہی خوف
وہی پیاس
وہی تیز ہوا

پھر وہی برف کی چادر وہی گُلنار بدن
پھر وہی دن وہی بوسیدہ شُعارِ اوّل
ہلکے بوسوں کی مہک بادِ صبا لائی ہے

اس سے پہلے بھی کئی بار زمستانوں میں
برف اترا کے گری میرے شبستانوں میں

گُلریز

(کشمیری مثنوی — از — مقبول کرالہ واری)

اقتباسات

سَراپا، نوش لَب کا

حسینوں میں وہی ممتاز تر ہے — قرارِ جاں ہے، صد رشکِ قمر ہے
مہِ کامل ہے، شانِ انجمن ہے — نظر افروز اُس کا بانکپن ہے
قدِ زیبا کی رعنائی نہ پوچھو — خراماں سروِ صحرائی نہ پوچھو
پئے گُل گشت جب آئے چمن میں — اضافہ ہو گلُوں کے بانکپن میں
قدِ زیبا زِ شمشادِ سرافراز — خراماں در گلستاں سروِ طنّاز
"خطِ باریک بر فرقش ہویدا — رہِ خضر است در ظلمات پیدا"
چمکتی بجلیاں سی عارضوں میں — مہِ تابندہ جیسے بادلوں میں
نہ پوچھو عنبریں زُلفوں کی باتیں — نہائی جیسے کاجل میں ہوں راتیں
اگر اُس زُلف کا اک تار ٹوٹے — ابھی اک تار ہر زُنّار ٹوٹے

مژہ سے اشک گر اک بار ٹوٹے | اچانک دل میں نوکِ خار ٹوٹے

قدم بوسی کو زلفوں کا اترنا | الجھ کر رہگذاروں کا سنورنا

میانِ موئے مشکیں جوئے لرزاں | چلی آئی ہے ماتھے تک خراماں

جبیں ابرو کے محرابوں میں ایسے | عطارد برجِ میزاں میں ہو جیسے

جبیں ہے یا کہ ماہِ نیم ہفتہ | یہ برجِ قوس جائے خود گرفتہ

جبینِ ناز پر جھومر کہ زہرہ | کہ ہے خورشید پر مریخ ٹھہرا

کماں ابرو کی کچھ ایسے تنی ہے | کہ جیسے چشم و ابرو میں ٹھنی ہے

کماں ہے ماہِ نو یا تیغِ خونریز | برائے کشتنِ دلِ خستگاں تیز

ہلاکِ جنبشِ ابرو زمانہ | اسیرِ حلقۂ گیسو زمانہ

جبینِ سادہ پر ہلکا سا تل ہے | کہ بحرِ حسن میں عاشق کا دل ہے

کنول کے پھول پر زنبور سا ہے | یہ تل ہے یا کہ مہوش سو رہا ہے

پسِ گیسو دو آویزاں درخشاں | سنوارے مشتری آغوشِ میزاں

گھنی زلفوں میں روشن گوشوارے | عجب تارِ نظر میں ہیں ستارے

بلا کی شوخ ہیں گستاخ تر ہیں | نگاہیں نازنیں کی پردہ در ہیں

چھلک پڑتا ہے سرمہ چشمِ تر سے | ستارے ماند پڑ جاتے ہیں ڈر سے

نگاہ نرگسِ رعنا کی مستی
خجل ہے جس کے آگے مے پرستی

نگاہِ گرم سے عاشق جلے ہیں
غزالاں جانبِ صحرا چلے ہیں

نگاہ فتنہ ساماں کی نہ پوچھو
نہ پوچھو چشمِ حیراں کی نہ پوچھو

نہیں اس کو غرض خنجر زنی سے
جہاں گھایل ہے مژگاں کی انی سے

رُخِ روشن پہ گیسو کھل رہے ہیں
پڑے کانوں میں موتی ڈھل رہے ہیں

شبِ تاریک روشن ہو رہی ہے
قیامت دیکھنے کو سو رہی ہے

رُخِ پُر نور کالے گیسوؤں میں
گلاب آسا کھلا ہے سنبلوں میں

پسِ گیسو چمکتے ہیں ستارے
نہیں یہ نقرئی زیور ہیں سارے

چمکتا کان میں بالا پڑا ہے
کہ جیسے چاند میں ہالہ پڑا ہے

رُخِ زیبا نہاں زلفوں میں ایسے
چھپا ہو بادلوں میں چاند جیسے

قیامت ہے وہ رُخ پر خال اس کا
بیاں کس طرح ہو احوال اس کا

جواں حبشی گلوں کی انجمن میں
جنوں کا داغ ماہِ سیم تن میں

غرض دارِ دامِ زلفش خال دانہ
فریبِ جانِ مرغانِ زمانہ

بیاں بینی کا بس باریک بینی
کروں الفاظ سے کیا نوشہ چینی

ہر اک کو کاٹ کر رکھدے وہ خنجر
غلام و خسرو و سلجوق سنجر

دہن کو دیکھ کر غنچہ کھلا ہے
دلیلِ اعتدالِ گُل ہوا ہے

لبِ خوش رنگ یا یاقوتِ لرزاں
چمک کو دیکھ کر حیران مرجاں

لبِ لعلیں سے شیرینی عیاں ہے
شکر میں ایسی شیرینی کہاں ہے

تبسم دِل کشائے دِلبراں ہے
دُرِ نایاب زیرِ لب نہاں ہے

دوائے غم تب و تابِ تبسّم
لبِ گُل گوں پہ سیلابِ تبسّم

دہن اس کا کمالِ شانِ گوہر
لبِ شیریں ہے یا قندِ مکرّر

سُخن سنجی میں یکتائے زمانہ
کہ ہر اک حرف ہے موتی کا دانہ

حلاوت خیز ہے سیمیں زنخداں
کہ سیبِ سیم آشوبِ دل و جاں

پُر از مے چاہِ زمزم ہے کہ گرداب
قرارِ جان و دِل نایاب نایاب

زنخ پر خال ایسے رونما ہے
کہ زنگی حوضِ کوثر پر کھڑا ہے

عبث ہے گردنِ مینا کی تعریف
عمودِ صبح کی کیسے ہو توصیف

غزالوں میں وہ رعنائی نہیں ہے
صنوبر میں وہ زیبائی نہیں ہے

گلے میں ہار مروارید کا ہے
یہ منظر دید کا ہے دید کا ہے

ہے سینہ جلوۂ سیماب جیسا
اندھیری رات میں مہتاب جیسا

نمایاں برف سے شفاف تر ہے
یہ سینہ آئینے سے صاف تر ہے

نہیں آئینہ اس سینے کا ہمسر ‏ ‏ دو پستاں دو حُباب آبِ کوثر

"دو پستاں دو انار نو رسیدہ ‏ ‏ دو پستاں غنچہ ہائے نو دمیدہ"

تنِ سیمیں سراپا ناز پرور ‏ ‏ دو بازو شاخِ شمشاد قد آور

نگاریں ساعدِ سیمیں سمن ہے ‏ ‏ لطافت میں مثالِ نسترن ہے

گُلِ دستِ حنائی اس پری کے ‏ ‏ جُدا انداز ہیں اُس رس بھری کے

حنائی گُل سے رنگین ہاتھ اس کے ‏ ‏ کہ خونِ بُلبُلِ رنگیں نوا سے

گُلِ لالہ سے بھی ناخن ہیں روشن ‏ ‏ نمایاں انگلیوں میں رنگِ گلشن

نہیں معلوم شاید دلرُبا کو ‏ ‏ رگِ گُل خار اس کے پشتِ پا کو

عیاں ہو کر نہاں موئے کمر ہے ‏ ‏ "کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے"

ورق چاندی کے پارے میں ملے ہیں ‏ ‏ اسی سے کوہ رانوں کے بنے ہیں

ز رشکِ ناف، نافہ اُڑ چلا ہے ‏ ‏ مشامِ جاں معطر ہو گیا ہے

نہیں ہے ناف، نافہ عنبریں ہے ‏ ‏ پریشاں، دربدر آہوئے چیں ہے

حصارِ سنگِ مرمر میں نہاں ہے ‏ ‏ دُرِ ناسُفتہ پوشیدہ کہاں ہے

پہنچنا واں تصور کا ہے دشوار ‏ ‏ حصارِ مرمریں میں گنج بے مار

ستوں مرمر کے ہیں یا ساقِ سیمیں ‏ ‏ کفِ پا یا کفِ دریائے رنگیں

کفِ پا سُرخ ہے رنگِ حنا سے
کہ خونِ عاشقانِ باصفا سے

کروں کیا وصف اس جانِ چمن کا
پری پیکر نگارِ گل بدن کا

ملاحت میں وہی جادو لقب ہے
لطافت ہی لطافت نوش لب ہے

شہزادہ عجب ملک کی آہ و زاری

محبت میں مجھے برباد کر کے
چھپے ہو کس جگہ بیدار کر کے

مری آہیں مری فریاد سُن لو
ہوا ہوں کس طرح ناشاد سُن لو

جُدائی میں عجب مُشکل پڑی ہے
تباہی پر مری قسمت اڑی ہے

خُدا کے واسطے جلوہ دکھا دے
مجھے جینے کا کچھ تو حوصلہ دے

کہانی نوش لب تیری سُنی ہے
مرے احساس پر بجلی گری ہے

تری فُرقت میں یوں بیکل ہوا ہوں
مثالِ شاخِ نازک جل رہا ہوں

مرا اندازِ ننگِ خسروی ہے
جنوں کی کیفیت کیا چھا گئی ہے

ستائش حُسن کی تیرے سنی ہے — اسی سے میری جاں پر آ بنی ہے
عیاں رازِ محبت ہو رہا ہے — جنوں کا بیج دِل میں بو رہا ہے
میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں — درونِ دِل کی حالت کہہ رہے ہیں
گریباں چاک میرا ہو گیا ہے — کہوں کس سے مجھے کیا ہو گیا ہے
نہ پوچھو شامِ ہجراں حال میرا — مثالِ شمعِ سوزاں حال میرا
سحر تا شام ذکرِ نوش لَب میں — پریشاں حال ہوں اُسکی طلب میں
گریباں چاک مُنہ پر خاک مَل کر — جُدائی میں ہوا ہوں راکھ جَل کر
جہاں داری کہاں ! شہزادگی ہے — مرا اسلوب اب دیوانگی ہے

جب بات محبت کی پھیلی

گجر دَم، طائرِ شیریں نوا نے — نویدِ صُبح دی بادِ صَبا نے
اندھیرا چھُٹ گیا نُور پھیلا — اچانک کیسے نزد و دُور پھیلا
شبِ تاریک کے سائے رواں تھے — فضا میں قمریوں کے کارواں تھے
لباسِ شہر یاری چاک کر کے — جبیں کو سجدہ گاہ خاک کر کے

عجب تلک[1] اچانک بول اُٹھا — تہی از خواب آنکھیں کھول اُٹھا
رفیقوں سے کہا ہم لُٹ گئے ہیں — محبت کے سفر میں جُٹ گئے ہیں
ہمارا دِل پریشانی کا گھر ہے — جہانداری کی ہم کو کیا خبر ہے
ہمارے واسطے اک کام کر لو — ذرا تم اہتمامِ جام کر لو
کرو آراستہ اک ایسی محفل — بپا تھی رات کو جو ویسی محفل
ہوئی فرمان کی تعمیل فوراً — ہوئے حاضر سبھی یارانِ پُرفن
پڑی جب چوٹ سازوں پر پیاپے — بجے محفل میں سنطور و دف و نے
بڑھی عاشق کے دِل کی بے قراری — سَرِ محفل ہوئی پھر آہ و زاری
اُسے یاد آگئی اُس دِلرُبا کی — سُنی تھی داستاں جس دِلرُبا کی
سَرِ محفل وہ رُسوا ہو رہا تھا — وہ کیا تھا اور وہ کیا ہو رہا تھا
پُکار اُٹھا کمالِ بے بسی میں — ہوا برباد ہوں میں دِل لگی میں

عزیزو چارہ گر کو جا بُلاؤ
خُدارا حالِ دِل اُس کو سُناؤ

---

[1] کشمیری میں تلفظ اسی طرح ہے۔

آسمان چُپ رہا

تشنگی خیمہ زن دشت و صحرا میں تھی
خاک و خون میں نہایا ہوا جسم سینہ سپر
خون آلودہ ہونٹوں پہ حرفِ وفا
قطرہ قطرہ
اذاں میں سناتا ہوا
سُوئے مشہد چلا
آسماں چُپ رہا

جسمِ گولان کی چوٹیوں پہ کھڑا
رقصِ بسمل میں گُم
نیم وا چشمِ حیراں میں خوابوں کا دجلہ سجائے ہوئے
ارضِ موعُود کا وِرد کرتا رہا۔

آسماں چُپ رہا

ایک نظم

خواب میں کون بُن رہا ہے مجھے
شعر میں کون سُن رہا ہے مجھے
کس نے گاڑا مجھے خلاؤں میں
سنگ میں کون چُن رہا ہے مجھے
دھوپ سے جسم ڈھانپ لیتا ہوں
آتشِ غم میں راکھ ہوتا ہوں

رات بھر ظُلمتوں کے سائے میں
شمع کی طرح میں پگھلتا ہوں
موسمِ گُل سے برف زاروں تک
سینکڑوں رنگ میں بدلتا ہوں
رات کے دَر پہ اک سوالی ہوں
صُبح کی سلطنت کا والی ہوں

وَالّیلِ اِذا یغشیٰ

ردائے تیرگیٔ شام اوڑھ کر نکلی
سجا کے مانگ میں تاروں کا نور لے کے چلی
چھپائے مہرِ درخشاں کو اپنے سینے میں
اُتر رہی ہے بصد تمکنت خلاؤں سے
ہٹا رہی ہے شعاعوں کو اپنی راہوں سے

سمیٹتی ہے زمانے کو اپنی بانہوں میں
لُٹا نہ اس کے تقدّس کو خانقاہوں میں
سکوں کی دولت بیدار کا یہی گھر ہے
طِلسم بُود و وُجُود و شہود کا دَر ہے

تب کیا ہوگا

تُم کیا جانو شُدنی کیا ہے
ہونی کیا انہونی کیا ہے
گونجے گی آواز فضا میں
گونجے گی لاہوت کے دل میں
گونجے گی ناسوت کے تل میں
گونجے گی جبروت سے لے کر
ارض و سما کی ہر منزل میں
چمکے گا آواز کا شعلہ
دشت و جبل میں
بحر و بر میں
تارِ نظر میں
ارضِ قمر میں

جھلمل تاروں کی کرنوں میں
رم جھم پانی کی بوندوں میں
چمکے گا آواز کا شعلہ
دھرتی ریزہ ریزہ ہو گی
چاند گرے گا ٹکڑے ٹکڑے
پربت پربت ٹکرائیں گے
تل پٹ ساری دنیا ہو گی
ڈھول فضا میں لہرائے گی
سورج شعلے برسائے گا
قبروں کے منہ کھل جائیں گے
مُردے زندہ ہو جائیں گے
پھر کوئی بھید نہ بھید رہے گا
نب کی بندش ڈھیلی ہو گی
آٹھ فرشتوں کے کاندھوں پر
رب کا عرش معلّیٰ ہو گا
تب کیا ہو گا؟

نوحہ

سچ کی مٹی، جھوٹ کا کندن، اپنا اپنا سرمایہ ہے
پیکر، پیکر کا سایہ ہے

دل کے بوڑھے ڈھیلے چہرے کا سایہ
رات کا سایہ
صبحِ سعادت، سایہ سایہ
ہاتھ لحاف سے باہر باہر
نیند کی گولی کا کنٹینر
سرہانے پر خالی خالی
خالی بوتل
سگریٹ کے بٹ
بند ہے اندر سے دروازہ

چاند کی کرنوں کو پہنے گی　　تاروں کا گجرا باندھے گی
اپنی مانگ میں چٹکی بھر سندور لگائے
جسموں کے جنگل کی ہرنی
کتنے پیڑ گرائی جائے
صحرا صحرا دھول اڑائے　　جنگل جنگل آگ لگائے

شورِ خموشی کے شہزادے — چپ کا گونگا کرب رہے
لفظوں کو آزاد کرا دے — معنی کی ایجاد مگر ہو
بستی بستی آگ لگا دے — دریا دریا دھوم مچا دے
ہو جائے بے داغ اندھیرا — کرنوں کے تختے جلا دو
آنکھیں اپنی نیند سے خالی — جھوٹا سچا خواب دکھا دو
ایک بدن کا تیس برس ہے — بارِ گراں کاندھوں پر لادے
ٹیبل ٹیبل آوارہ ہوں — داخلِ دفتر مجھ کو کرا دے
توڑ رہا ہے جھوٹے بندھن — پاس بلا لے ساتھ بٹھا دے

بند ہے اندر سے دروازہ
ہرنی پتھر چاٹ رہی ہے

مکڑی جالا کاٹ رہی ہے

ایک نظم

پیلا سورج
نیلی مٹی
کالے سایے
آدھا سینہ، زیرِ قبا
سانسوں کی خوشبو کا کُہرا
کومل پگڈنڈی پر تنہا

بھکی سڑکیں
مٹیالے دِن
موٹر گاڑی، تانگے لاری، لنگڑے لُولے
بھری سڑکیں
اندھے ٹُوٹے پھوٹے دوپائے
کمسن بچے، لنچ کے ڈبّے
شور شرابا، میلے ٹھیلے
شوں شوں، گوں گوں
کھٹ کھٹ، ٹھک ٹھک
آوازوں کا پاگل ساگر

پکّی کالی، راہگُذر پر خون کے دھارے
پُھوٹ بہے اور سوکھ گئے ہیں
کوئل پگڈنڈی پر تنہا
کوک رہی ہے
پیلا سورج ڈوب گیا ہے
بھُوری مِٹّی لال ہوئی ہے

لوری

عہدِ طفلی کہ مرے گھر کے کھُلے آنگن میں
عید آتی تھی مسرّت کے کئی خواب لئے
قہقہے، شوخیاں، معصوم شرارت کے ہجوم
رنگ اور نُور کا ٹھہرا ہُوا سیلاب لئے

صُبح اُٹھتے ہی بُزرگوں سے دُعا ملتی تھی
اور آداب پہ انعام بھی مل جاتا تھا
پھلجڑی چھوٹتی، نظروں کے چمن کِھل اُٹھتے
دِل کہ معصوم تھا ان سے بھی بہل جاتا تھا

اب بھی گھر ہے وہی مہکا ہوا آنگن ہے وہی
اس بھرے گھر میں مگر کوئی نہیں، کوئی نہیں
آشنا چہرے شب و روز ہی ملتے ہیں مگر
ان میں کوئی بھی نہیں جو کہ ہو فرخندہ جبیں

کاش اس رسم کی پالی ہوئی دُنیا میں کبھی
کوئی رسماً ہی تجھے اپنا بنا کر دیکھے
صرف اِک حرفِ مُروّت کی جواں آہٹ سے
میرا سویا ہُوا احساس جگا کر دیکھے

نِروان

ہاں اسی پیڑ تلے شام ڈھلے آئی تھی
اس سے پہلے بھی کئی بار وہ رنگین ساعت
گنگناتی ہوئی ہر شام یہاں سے گزری
کتنے یُگ بیت گئے اور نہ اُسے یاد آیا
ایک شہزادہ اُسی پیڑ تلے بیٹھا ہے
اور سنّاٹے میں اُس پیڑ پہ تنہا پنچھی
مدھ بھرے سُر میں کوئی بول سُنا جاتا ہے

گُمشدگی

نہ وادیوں سے نہ کہسار سے پتہ پوچھو
نہ مجھ کو جھیل کی گہرائیوں میں تُم ڈھونڈو
میرا سُراغ نہ پاؤ گے خانقاہوں میں

جو شہر آؤ تو کمپیوٹروں سے مِل لینا
انہی سے اپنی خبر اور مرا پتہ لینا

کلمۂ شکر بنامِ لبِ شیریں دہناں

عظمتِ صحبتِ خوباں کی روایت بانٹیں
شہر میں فیض نہیں کس سے رقابت بانٹیں

سلطنتِ شہرِ نگاراں کی ہوئی ہے تاراج
کس سے اب صحبتِ یاراں کی حکایت بانٹیں

کون اب ہجر کی راتوں کو گرانی بخشے!
کس سے اب وصل کے لمحوں کی شرافت بانٹیں

غیر اب ناوکِ دشنام چلائیں کس پر
یار اب کس سے نئی طرزِ ملامت بانٹیں

محتسب گریہ کناں ، پیرِ مغاں ہے برہم
کس کی محفل میں مئے شانِ طریقت بانٹیں

ہم سے گر اہلِ کرم ، اہلِ نظر بن کے ملیں
ہم بھلی کیا بات کریں سرِّ ولایت بانٹیں

اب مسرّت کے خزانوں پہ کڑے ہیں پہرے
خوش رہیں خاک نشیں ہم سے مصیبت بانٹیں

"کلمۂ شکر بنامِ لبِ شیریں دہناں"
صحبتِ ہجر کریں گنجِ رفاقت بانٹیں

فیض کے عشق کی فاروق پہ تہمت ٹھہری
دوستو، چارہ گرو، آؤ یہ عزّت بانٹیں

نگیٹیو

چُھپ گیا کالی گپھا میں چُھپ گیا
نقطۂ موہوم تھا اک دائرہ، اب
خواب کا سایہ بنا ہے
نیند کا جادو جگاؤ
روشنی کو ڈھیر کردو
تیرگی کا راج ہوگا
کل کے دِل میں آج ہوگا
پیکرِ شب کے بدن میں
موجِ خوشبوئے فروزاں
زُلفِ شبّو کی گرہ سے
عنبرِ لرزاں، ہویدا
چُھپ گیا کالی گپھا میں
دُشمنِ اسرارِ پنہاں

نظم نمبر ۷۷۷

رات کی آہنی خموشی میں
تُم نے دیکھا ہے نُور کو محبوس
بات کو قید، لفظ کو پابند
لَب مُقفّل، نِگاہ آہن پوش
کان آواز کو ترستے ہوں
پیڑ بے سُدھ، پہاڑ سنجیدہ
بُت اکیلا ہو بند کمرے میں
تیسری آنکھ گُنگُناتی ہو

آگ یخ بستہ، آب جلتا ہو
خواب گویا، حقیقتیں خاموش
نُور تاریک، تیرگی روشن
احمریں خاک، پھول بے چہرہ
سَرو بے قد، چنار بالشتہ
ریت لرزاں مگر ہوا جامد

ایسی دنیا خیالِ خام نہیں
ایسی دُنیا کا کوئی نام نہیں

دمِ رخصت

گھر سے نکلا تو در و بام سے آئی آواز
اپنا کل چھوڑ کے کس حال میں رہنا ہے تجھے
راستہ دور تلک تجھ کو صدا دیتا ہے
تیرا فردا ہوں مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
آئینہ توڑ کے کمرے میں چلا آیا ہوں
چھوڑ کے خود کو ہر اک چیز اٹھا لایا ہوں

میری بزمِ غم گساراں

گئے موسموں کے ساتھی
تو متاعِ جاوداں ہے
کوئی فاصلہ نہ دُوری
تیرے میرے درمیاں ہے
میں دیارِ شب گزیدہ
تو چراغِ ضُو فشاں ہے

گئے موسموں کے ساتھی

غم اگرچہ جاں گُسل ہے
تری یاد ہے سہارا
تو قرارِ جان و دِل ہے
رُخِ شہرزادِ خُوباں
تیرے سامنے خجل ہے
گئے موسموں کے ساتھی

میری رہگُذر کے راہی
مرے شوقِ بے ریا کی
ہے تجھی سے کج کُلاہی
میں فقیرِ عاشقی ہوں
تیری ٹھوکروں میں شاہی
گئے موسموں کے ساتھی

میرے ہم قدم مُسافر
مرے ہم نظر مُصوّر
تیرے خد و خال لے کر
جو رقم ہوئے مناظر
سرِ شام جاگتے ہیں
وہی میری چشمِ نم پر
گئے موسموں کے ساتھی

تو شرارِ آگہی ہے
میں ردائے شہرِ ظلمت
تو نظر کی روشنی ہے
ترے حُسن کی شرافت
میرے شعر میں ڈھلی ہے
گئے موسموں کے ساتھی

میری مَے کشی تُجھی سے
مری مَے، اَیاغ تیرا
شبِ غم کی خلوتوں میں
میں ہوں بَس سُراغ تیرا
گئے موسموں کے ساتھی

ترے دَم سے دِلرُبائی
شب و روزِ زندگی میں
میں اسیرِ خود ستائی
تو شریفِ کُنجِ عزلت
میں رذیلِ خود نُمائی!
گئے موسموں کے ساتھی

میں فریبِ خود پرستی
تو یقینِ خود شناسی
میں گمانِ سوزِ ہستی
تو کمالِ بے نیازی
میں زوالِ دِل نوازی
گئے موسموں کے ساتھی

میرا غم تیری عنایت!
مری سر خوشی کی زینت
میں ہوں موجِ نا شناسی
تُو ہے قُلزم ولایت
تیرے ساتھ جو گزارے
وہی روز و شب غنیمت
تیری قُربتیں بھی میری
تیری فُرقتیں بھی میری

M. A. Andrabi

آخری خواب سے پہلے